جناب بشیر احمد ڈار

وحدتِ وجود ۔ ایک تنقیدی جائزہ

(آخری قسط)

وحدتِ وجود اور وحدتِ انسانیت

وحدتِ وجود کے حامی اکثر اوقات ایک غلط نظریہ پیش کرتے ہیں ۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا حقیقی سبب کیا ہے ۔ یہ کہتے ہیں کہ وحدتِ وجود کا نظریہ وحدت انسانیت پر منتج ہوتا ہے اور اگر اس کے برعکس وحدتِ شہود کا نظریہ اپنایا جائے تو انسانیت کی وحدت کا تصوّر مجروح ہوگا ۔ اس سے وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے جو انسانوں میں تفریق پیدا کرتی ہے ۔

پروفیسر سرور ، مولانا عبیداللہ سندھی کا بیان نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "میرے فکر کی بنیاد یہ ہے کہ انسانیت عامہ کی معاشی فلاح کے حصول کے لیے مذہب کا انکار ضروری نہیں"[1] لیکن اس کے بعد پروفیسر سرور لکھتے ہیں کہ مولانا سندھی جب مذہب کا نام لیتے ہیں تو اس سے ان کی مراد "وہ مذہب تھا جس کی اساس عقیدۂ وحدت الوجود ہے ۔ اس میں سب مذاہب اس ایک مرکزی نقطہ پر جمع ہو جاتے ہیں ۔ خدا کے اس وحدت الوجودی تصوّر پر پوری انسانیت کی مذہبی وحدت ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ مولانا کے فکر کا ایک بنیادی تصوّر ہے"[2]

اس کے بعد ایک جگہ زیادہ واضح طور پر فرماتے ہیں کہ : "وحدت الوجود قوموں اور مذہبوں کے درمیان پر امن بقائے باہمی کی فضا پیدا کرتا ہے اور اس سے لازماً یہ رجحان کمزور پڑتا ہے کہ صرف ایک مذہب سچا ہے اور باقی سب باطل ہیں"[3]

یہ صحیح ہے کہ دنیا میں مختلف مذاہب موجود ہیں ۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہر مذہب کا پیرو اپنے مذہب کو صحیح اور دوسرے مذاہب کو غلط سمجھتا ہے ، لیکن اس کے باوجود سب مذہبوں کے پیروؤں کے درمیان پُر امن بقائے باہمی کی فضا پیدا کی جا سکتی ہے ۔ اس کی نمایاں مثال قرآن حکیم کی وہ دعوت ہے جو اس نے عرب میں موجود دوسرے مذاہب کے پیروؤں کو دی : " اے اہلِ کتاب !

---

[1] افادات و ملفوظات مولانا سندھی ص ۲۲۷ ، ۲۲۸   [3] ایضاً ص ۳۴۱

آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے: یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے ....." (۳: ۶۴) اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ خالص دین کے نقطۂ نگاہ سے پُرامن بقائے باہمی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اس قرآنی دعوت کے مفہوم پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ چند بنیادی حقائق ہیں جو ہر صحیح مذہب کی جان ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ ایک مذہب سچا ہے اور دوسرے مذاہب جھوٹے ہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ چند حقائق ہیں جو صحیح ہیں اور ان کے متضاد تصورات غلط ہیں صحیح اور غلط کی تقسیم مذاہب کی نہیں بلکہ نظریات کی ہے۔ وحدت الوجود کے نزدیک سب مذاہب جھوٹے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ وحدت الوجود کی نگاہ میں وہ تمام لوگ جو کسی مذہب کی پیروی کرتے ہیں، محض مایا یا سراب کی پیروی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ سچ اور جھوٹ، نیکی اور بدی، جنت اور جہنم، خوبی اور برائی محض موضوعی، غیر حقیقی اور بے حقیقت تصورات ہیں۔

فصوص الحکم میں ابن عربی قرآنی آیت: فاینما تولوا فثم وجہ اللہ (۲: ۱۱۵) کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "کہ ہر شخص راہ راست پہ ہے، کُل راہ راست والے ماجور ہیں، اور کُل ماجور سعید ہیں اور کُل سعید اپنے خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں[۳۶] خیر و شر کی تمیز اخلاقی نقطۂ نگاہ کی بجائے محض حیاتیاتی یا نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے تسلیم کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں: "خیر سے میرا مطلب یہ ہے کہ اس کی (یعنی شخص کی) غرض سے موافق ہو، اور شر سے مقصود یہ ہے کہ اس کی غرض کے مناسب نہ ہو"[۳۷]

تاریخی پس منظر

اگر وحدت الوجود کے فلسفیانہ نظریے کو تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو مذہب کے ساتھ اس کے تضاد کا مسئلہ کچھ اور واضح ہو سکے گا۔

رواقی مکتب[۳۸] فکر کے بعد سب سے پہلا حکیم و فلسفی جس نے وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا،

---

[۳۶] فصوص الحکم ص ۱۵۳ [۳۷] ایضاً ۱۵۸

[۳۸] رواقی فلسفہ جس دور میں پیدا ہوا، یونانی تمدن زوال پذیر تھا اور سیاسی حالات بالکل غیر یقینی تھے

وہ محی الدین ابنِ عربی الشیخ الاکبر تھا۔ وہ جنوب مشرقی اسپین کے ایک شہر میں ۵۶۰ھ-۱۱۶۴ء میں پیدا ہوا۔ اڑتیس سال کی عمر میں وہ مشرقی ممالک کی سیاحت کے لیے نکلا۔ شمالی افریقہ کے مختلف ملکوں کی سیاحت کرتے ہوئے ۵۹۸ھ-۱۲۰۱ء میں مصر پہنچا۔ اس کے بعد ایشیائے کوچک حلب، بغداد، بیت المقدس، مکّہ سے ہوتا ہوا آخرکار دمشق پہنچا جہاں وہ ۶۳۸ھ-۱۲۴۰ء میں وفات پا گیا۔

تیرھویں صدی عیسوی کا یہ پہلا نصف مسلمانوں کی تاریخ میں بہت اہم ہے اس لیے کہ اس دَور میں وہ عظیم الشان تمدن جو غیر معمولی انسانوں کی ان تھک کوششوں سے چھ سو سالوں میں قائم ہوا تھا زوال پذیر ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کا سیاسی تفوق تو شاید آنکھوں کو خیرہ کرتا ہو اور ان کے شہروں کی عظمت اور لائبریریوں میں کثرت ہجوم لوگوں کو دھوکا دیتا رہتا ہو لیکن اخلاقی زوال اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ جیسا تاریخ بتاتی ہے، تباہی اس کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔ یہی وہ دَور تھا جب ایک طرف حسن بن صباح کے پیرو لوگوں کا چین و سکون چھین رہے تھے جس کے باعث زندگی غیر محفوظ اور غیر یقینی ہو چکی تھی۔ دوسری طرف صلیبی حملہ آوروں کی وحشیانہ یلغار کے باعث پناہ گزینوں کے قافلے فلسطین سے نکل کر ارد گرد کے شہروں میں پناہ لینے کے لیے امڈے چلے آ رہے تھے۔ پہلی صلیبی جنگ ۴۸۸-۴۹۳ھ-۱۰۹۵-۱۰۹۹ء تک جاری رہی اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے بے شمار حملے ہوتے رہے۔ چھٹا حملہ ۶۲۵ھ-۱۲۲۷ء میں ہوا۔ ان حملوں سے وہ تمام اسلامی ممالک بُری طرح متاثر ہوتے جہاں جہاں ابنِ عربی جاتا رہا۔ پھر خود مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ بغداد کے خلیفہ الناصر (۵۷۶-۶۲۲ھ-۱۱۸۰-۱۲۲۵ء) نے منگولوں کو خوارزم شاہ کی وسیع سلطنت پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ یہ خوارزم شاہی سلطنت کوہ یورال سے لے کر بحیرہ کیسپین اور فرات سے لے کر سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ چنگیز خان نے اس سلطنت پر ۶۱۶ھ-۱۲۱۹ء میں حملہ کر دیا۔ یہ وہ دَور تھا جب ابن عربی انہی علاقوں میں موجود تھا۔ ابن اثیر اور دیگر معاصر

چنانچہ مغربی فلسفہ کے مورخین کہتے ہیں کہ وہ "تباہی کے دَور" میں پیدا ہوا۔ دیکھیے سٹیس کی کتاب یونانی فلسفہ کی تنقیدی تاریخ (۱۹۵۶ء، لندن) ص ۳۵۳۔

مورخین نے جو تفصیلی واقعات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان لوگوں کے ذہنوں پر کیا کیا نہ گزرا ہوگا جو اس خطرناک دور میں ان مصائب کا سامنا کر رہے تھے۔[۵۶]

اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ پڑھے لکھے باشعور طبقے کے ذہن میں اسلام کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہونا شروع ہوئے۔ قرآن نے تو وعدہ کیا ہے کہ اس زمین کی سلطنت و خلافت مسلمانوں کے لیے وقف ہے۔[۵۷] اس آیت مبارکہ کا مفہوم انھوں نے کچھ یوں سمجھا ہوا تھا کہ اگر مسلمان بداعمالی بھی کریں تب بھی حکومت انہی کے پاس رہے گی، اور اب جو سلطنت اور دنیا کی حکومت ان کے ہاتھ سے نکل کر دوسروں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے تو ضرور خدا کی تقدیر اور فیصلہ ان کے حق میں ہو چکا ہے۔ ایسے حالات میں یہ تصور پیدا ہوا کہ اسلام کا دور اب ختم ہو چکا ہے۔ اب اس سے ایک مختلف نظریہ پر ایمان لانا چاہیے جس میں یہ گنجائش ہو کہ وہ مروجہ حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکے۔

اس دور کے مسلمان کے ذہنی خلفشار کو مولانا روم نے بہت وضاحت سے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ: "محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص نے کہا: میں یہ تیرا دین نہیں چاہتا، خدا کی قسم نہیں چاہتا۔ اپنے اس دین کو مجھ سے واپس لے لے۔ جب سے میں تیرے دین میں آیا ہوں، ایک دن آرام نہیں ملا۔ مال گیا، عورت گئی، بیٹا نہ رہا۔ عزت نہ رہی، شہوت نہ رہی۔"[۵۸] یہ اس دور کے حالات سے پیدا شدہ ذہنی خلفشار کا ایک ہلکا سا نمونہ ہے۔

ذہنی خلفشار

میری رائے ہے کہ وحدت الوجود کا فلسفیانہ نظریہ اسی ذہنی خلفشار کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اس کے مطابق اسلام اور کفر، نیکی اور بدی، حرام و حلال میں کوئی فرق نہیں۔ آپ اگر ایک

---

۵۶ ان کی تفصیلات کے لیے دیکھیے پروفیسر شریف مرحوم کی مرتب کردہ تاریخ فلسفۂ اسلام۔ جلد دوم، ص ۷۹۰-۷۹۵۔

۵۷ قرآن حکیم: ۲۴، ۲۵

۵۸ فیہ ما فیہ اردو ترجمہ ص ۱۸۲۔

عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں تو بھی صحیح، اگر آپ اس کے برعکس کسی اور عقیدہ کو صحیح سمجھتے ہیں، تب بھی آپ صحیح راستے پر ہیں۔ فصوص الحکم آپ کے سامنے ہے ۔ بے شمار لوگوں نے اس کی تشریحات لکھی ہیں، آپ ان سے صرف نظر کیجیے، خود اصل کتاب کا مطالعہ کیجیے، آپ کو میری بات کی تصدیق ہو جائے گی ۔

قرآن حکیم کی ایک آیت ہے کہ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی (ناصیہ) اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے (۱۱، ۵۵)۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے شیخ اکبر فرماتے ہیں: "پس ہر چلنے والا (بلکہ ہر شے) اپنے رب کی سیدھی راہ پر ہے پس اس وجہ سے وہ مغضوب علیہم میں داخل نہ ہوا اور نہ ضالین میں جبکہ ضلالت اور غضب الٰہی دونوں عارضی امور ہیں اور ان کا مآل کار رحمت ہے تو رحمت ہی ہر شے پر وسیع ہوتی ۔ ۔ ۔"[۵۹]

وحدت الوجود کا نظریہ حالات سے مطابقت میں پیدا ہوا ۔ ہاں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اس نظریے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اصطلاحات اسلامی فکر ہی کی استعمال کی گئیں توحید اور وحدت الوجود دو متضاد نظریے ہیں لیکن اسلامی تاریخ میں وحدت الوجود کے لیے توحید اور اس کے ماننے والے کے لیے موحد کی اصطلاحیں ہی استعمال ہوتی رہیں ۔

شنکر اچاریہ کے افکار

وحدت وجود کا دوسرا مظاہرہ ہندوستان کی سرزمین میں شنکر اچاریہ کی ذات میں ہوا۔ شنکر اچاریہ کی زندگی اور فکر کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے میں ایک عام بات کہنی ضروری سمجھتا ہوں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کا خصوصی فکر وحدت وجودی ہے اور شاید اسی بنیاد پر آریائی اور سامی ادیان کی غلط تقسیم پیش کی جاتی ہے ۔ ہندوستان میں چھ فلسفیانہ مدارس فکر ہیں جن میں ویدانت ایک ہے ۔ اب بھگوت گیتا بھی ہے اور بدھ مت کے صحائف بھی ہیں۔ وشنو مت کے پیروؤں کی بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ بھگتی تحریک اور جینیا نیہ کے ماننے والوں کی بھی تصنیفات ہیں جن میں سے کوئی بھی وحدت وجودی نہیں ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یکطرفہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ

---

۵۹ فصوص الحکم، ص ۱۴۳، فص ہودیہ ۔

ہندوستان کا خصوصی فکر وحدت الوجودی ہے؟

اب رہا اپنشد کا معاملہ۔ یہ قدیم رشیوں اور صوفیوں کے ذاتی تجربات پر مشتمل صحیفے ہیں جہاں آپ کو ہر قسم کے دینی تصورات کی جھلک نظر آئے گی۔ یہ میں واضح کر چکا ہوں کہ تجرباتی طور پر وحدت وجود سے انکار ممکن نہیں لیکن اس تجربے کی بنا پر وحدت الوجود کا فلسفیانہ فکری ڈھانچہ اپنشدوں میں موجود نہیں۔ وہاں آپ کو خدا کا وہ تصور بھی ملتا ہے جسے ہم تشبیہی کہہ سکتے ہیں، اسی طرح جس طرح قرآن حکیم میں خدا کے ہاتھ آنکھوں وغیرہ کا ذکر ہے۔ ان میں تنزیہی تصور خدا بھی موجود ہے جس کو قرآن حکیم لیس کمثلہ شی ٔ کہہ کر بیان کرتا ہے۔ چنانچہ انہی صحیفوں کی بنیاد پر راما نوج، بھاسکرا اور نمبارک جیسے مفکر بھی اسی سرزمین میں آریاؤں ہی کی گود میں پلے ہوئے موجود ہیں جنھوں نے شنکر اچاریہ کی تاویل کو ردّ کیا۔

لیکن اس کے باوجود ہندوستان کے دانشوروں نے وحدت الوجود کے نظریے کو بڑی شدومد سے پھیلایا اور آج تک اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ میری رائے ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو جو ناکامی ہوتی ہے، اس کی ایک بڑی وجہ اس نظریے کے اثر کے باعث ہے مسلمان جہاں کہیں بھی گئے وہاں کی آبادی کے ذہن کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہوتے۔ لیکن اس سرزمین میں وہ یہ انقلاب پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ اسلام کا طرۂ امتیاز توحید ہی تو تھی اور خود مسلمان حکماء و صوفیا نے جب وحدتِ وجود کو توحید کا نقاب پہنا دیا اور ایک، وحدتِ وجودی ہندو موحد کے لقب سے نوازا گیا تو پھر اسے اسلام لانے کی کیا ضرورت تھی؟

جب شنکر نے (پیدائش ۷۸۸ عیسوی) ہوش سنبھالا تو ہندومت کے مقابلے پر بدھ مت کا نسبتہً زیادہ زور شور تھا۔ لیکن اس میں وہ بالیدگی اور زندگی نہ تھی جو کبھی اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ برہمن مت کا سارا زور اور اس کی زندگی کا دار و مدار ورن آشرم یعنی انسان کا مختلف ذاتوں میں منقسم ہونے پر تھا، جس میں برہمن کو باقی سب انسانوں پر اپنے علم و گیان کے باعث اور اپنی پیدائش کے لحاظ سے مکمل برتری حاصل تھی۔ بدھ مت نے ورن آشرم کے اس غیر انسانی نظریے کو کلی طور پر رد کر دیا تھا۔ اس میں انسان بہ حیثیت انسان صاحبِ تکریم تھا اور کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر برتری حاصل نہ تھی۔

لیکن جب شنکر اچاریہ نے دوسرے لوگوں (جن میں کمارل بھٹ سب سے زیادہ مشہور ہے) کے ساتھ مل کر بدھ مت کے خلاف تحریک چلائی اور ظلم و استبداد اور کشت و خون کا دروازہ کھولا[۱۵] تو اس نے اپنے زمانے کے دانشوروں کو قائل کرنے کے لیے وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا، جس کے مطابق حق اور باطل کی تمیز ایک اضافی شے ہے۔ عمل کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ علم اور محض علم کا حصول نجات کے لیے کافی ہے۔ علم کہ انسان اور خدا ایک دوسرے کا عین ہیں اور یہ علم صرف برہمن کے پاس مل سکتا ہے، وغیرہ وغیرہ[۱۶]۔

وحدت الوجود کا یہ نظریہ شنکر اچاریہ کے ہاتھوں میں غیر انسانی تصورات اور ظلم و ستم کی تاریک اور الم ناک تاریخ سے وابستہ ہے اور اس سے بدھ مت کو ختم کرنے کا کام لیا گیا۔ یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں یہ کس طرح دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وحدت الوجود صلح کل اور بلند انسانیت کے نصب العین کی حمایت کرتا ہے۔ جس طرح اسلامی ملکوں میں سیاسی شکست کے باعث اسلام کے مستقبل سے مایوس ہو کر وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا گیا، اسی طرح ہندوستان میں برہمنوں کے غیر انسانی اقتدار کی حفاظت کے لیے اس نظریے سے فائدہ اٹھایا گیا۔ اسی لیے شوپن ہاور نے کہا ہے کہ وحدت الوجود تو لادینیت کا روحانی پہلو ہے۔

اسپینوزا کا نظریہ

وحدت الوجود کا تیسرا مظہر مغرب کا مشہور فلسفی اسپینوزا ہے جس نے سترھویں صدی میں اپنا نظریہ پیش کیا۔ یورپ کی تاریخ میں یہ وہ دور ہے جب مذہب کے خلاف بغاوت کا آغاز ہوا۔ یہی وہ دور تھا جب سائنسی تحقیقات اور ریاضی سے شغف بڑھنا شروع ہوا۔ مذہب کا وہ

---

[۱۵] بدھ مت کے خلاف وحدت الوجود کے پیروؤں کے ظلم و ستم کی داستان کے لیے دیکھیے سر ولیم ہنٹر کی کتاب انڈین ایمپائر اور ریورنڈ ڈبلیو، ٹی، ولکنز کی کتاب

(لندن، ۱۸۸۸) ص-۱۱-

[۱۶] شنکر اچاریہ کے فکر کے فلسفیانہ پہلو کی تشریح کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون: ہندوستان میں وحدت وجودی اور توحیدی نظریات۔ مندرجہ سہ ماہی "اقبال"، لاہور، جنوری ۱۹۵۸-

تصوّر جس میں خدا اس کائنات کا خالق اور رب ہے جو لوگوں کی ہدایت کے لیے پیغمبر بھیجتا ہے، جن سے معجزات ظہور پذیر ہوتے ہیں ــــ وہ رب و خالق جو قادرِ مطلق ہے، **یفعل ما یشاء** ہے، جو اپنے بندوں کے قریب ہے، ان کی فریاد سنتا ہے وغیرہ وغیرہ ــــ یہ سب تصوّرات غلط قرار دیے جانے لگے۔ ایسے ماحول میں سپینوزا نے اپنا نظریۂ وحدت وجود پیش کیا جو اصطلاحات تو مذہب کی استعمال کرتا ہے لیکن ان اصطلاحات کے پیچھے جو مفہوم پوشیدہ ہے وہ خالص غیر دینی ہے۔ مثلاً لفظ "خدا" کو سامنے رکھیے۔ جب ہم عام طور پر خدا کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے مراد ایسی ہستی ہے جو اپنے ارادے میں مکمل طور پر آزاد اور اس کائنات کی خالق ہے لیکن یہی لفظ "خدا"، جب سپینوزا کے ہاں استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد وہ شے ہے جو فطرت کے ناگزیر اور اٹل قوانین میں محبوس ہے، جو ارادے سے کلی طور پر عاری ہے ــــ اور یہ شی وہی ہے جسے ہم "مادہ" کا نام دیتے ہیں سپینوزا میں وحدتِ وجود یا وحدتِ جوہر کا تصوّر ہے۔ اس سے مراد وحدت ذاتِ خداوندی نہیں بلکہ وحدت مادّہ مراد ہے۔

اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مولانا عبیداللہ سندھی کے نظریۂ وحدت وجود کی جو تعبیر کی گئی ہے وہ اسی مادیت کی آواز بازگشت ہے۔ پروفیسر سرور فرماتے ہیں (مولانا کی زبان سے) کہ کسی یورپی صحیح الفکر کو جو خدا کو نہیں مانتا، مادّہ کے علاوہ کسی اور خدا کا قائل کرانا ممکن نہیں۔ صرف وحدت وجود کا عقیدہ ہے جو آج کسی الٰہی فکر کی اساس ہو سکتا ہے۔[۱۲]"

اس عبارت کا سیدھا سادا مفہوم یہ ہے کہ توحیدی مذاہب پر ایمان لانا صحیح الفکر انسان کے لیے ممکن نہیں۔ اس سے زیادہ مہمل بات شاید ہی کسی کے قلم سے نکلی ہو۔ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ پروفیسر سرور کے نزدیک وحدت الوجود سے مراد ایسا نظامِ فکر ہے جس کی بنیاد مادّہ کے اس تصوّر پر ہے جو انیسویں صدی کے سائنس دانوں نے پیش کیا تھا۔

اگلے صفحے پر فرماتے ہیں: ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کو وحدت الوجود کے تصوّر کے بغیر عقلی طور پر منوانا بڑا مشکل ہے۔ اس تصوّر کی رُو سے وجود لامتناہی ہے اور اس کا کوئی ذرہ فنا نہیں

۱۲؎ افادات و ملفوظات، ص ۲۶۹

ہوتا۔ ظاہر ہے انسان مرنے کے بعد کیسے فنا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ تصور وحدت الوجود کے ذریعے انسانیت کا تسلسل ثابت کیا جا سکتا ہے۔[۳۹]

اس تمام دلیل کی بنیاد مادہ کا سائنسی تصور ہے۔ مذہب میں جو انسانی وجود کے تسلسل بعد الموت کا ذکر ہے، وہ انسان کے مادی جسم کا نہیں بلکہ اس کے روحانی وجود؛ اس کے اعمال کی ذمہ داری، سزا اور جزا کے معاملات ہیں جو مادے کے سائنسی تصورات کی مدد سے ثابت نہیں کیے جا سکتے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی تعبیر وحدت الوجود بالکل وہی ہے جس کا ذکر سپینوزا کے ذکر میں ہم کر آئے ہیں یعنی ان کا خدا وہی ہے جو سائنس دانوں کا مادہ ہے، خاص کر وہ تصور جو انیسویں صدی کے سائنس دانوں نے پیش کیا تھا۔

وحدت وجود کی اس تشریح کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وحدتِ انسانیت کا تصور کسی طرح بھی اس نظریے سے پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ یہ خدا کا توحیدی تصور ہے جو صحیح معنوں میں وحدتِ انسانی کے تصور کا ماخذ بنتا ہے۔ قرآن حکیم اس توحیدی تصور کا بہترین مظہر ہے اور اگر آپ غور کریں تو اسی کتاب مقدس میں انسانیتِ عظمیٰ کا بلند تصور واضح شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

---

[۳۹] افادات و ملفوظات، ص ۲۷۰

مسلمانوں کے سیاسی افکار

پروفیسر: رشید احمد

مسلمان مفکروں نے سیاسی نظریہ سازی کی تاریخ میں بہت اہم ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب میں مختلف زمانوں اور مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے مسلمان مفکروں اور مدبروں کے سیاسی نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بی۔ اے کے نصاب میں داخل ہے۔ قیمت: ۸ روپے

ملنے کا پتہ: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور